سعادت حسن منٹو کے چند غیر مدوّن کالم

ڈاکٹر محمد سعید

ABSTRACT:

Saadat Hassan Manto is a legendry personality in Urdu literature. Manto produced an appreciable literary material particularly in the field of Urdu Fiction. There are many published books, articles which cover many aspects of his life and work. But a mentionable aspect of his life is "Manto as a Journalist"is in darkness. Manto being a columnist of "daily Manshoor Lahore. The owner of this daily was Nwasb Muzafar Hussain Qazlibash a renowned Member of Republican party. Manto's four published columns in daily 'Manshoor" are discovered and analyzed by the author of this article. His Journalistic role or writings are still waiting for researchers.

سعادت حسن منٹو(۱۱مئی ۱۹۱۲ء۔ ۱۸۔جنوری ۱۹۵۵ء) کی صحافتی زندگی کی کئی گم شدہ کڑیاں تشنۂ تحقیق ہیں۔ وہ امرتسر، بمبئی اور لاہور میں قیام کے زمانے میں کئی ایک اخبارات اور رسائل و جرائد سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے۔ بطور مدیر اور کالم نگار بعض اخبارات اور جرائد سے اُن کی وابستگی کی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں۔منٹو کی صحافتی خدمات کو ابھی باقاعدہ موضوع نہیں بنایا جا سکا کیونکہ ان کی صحافتی تحریریں ابھی منظر عام پر نہیں آ سکیں۔ بمبئی کے زمانے میں فلمی صحافت سے وابستگی بھی ابھی پردۂ اخفا میں ہے اور قیام پاکستان کے بعد لاہور آ کر وہ جن جن اخبارات سے وابستہ رہے اس کے بھی بہت کم حوالے ملتے ہیں خصوصاً اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے اُن کے کالم یا دیگر تحریروں کی جمع آوری اور ترتیب و اشاعت کا کام ابھی محققین کی راہ دیکھ رہا ہے۔

منٹو اپنی وفات سے چند ماہ پہلے لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ **منشور** کے ساتھ بطورِ کالم نگار وابستہ ہوئے۔ڈاکٹر انیس ناگی (۱۹۳۹ء۔ ۷ اکتوبر ۲۰۱۰ء) نے اپنی کتاب **منٹو کی کہانی** (۲۰۰۵ء) میں محض منٹو کی روزنامہ **منشور** سے وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ان کے علاوہ اس اخبار سے وابستہ رہنے کا کسی منٹو شناس

نے ذکر نہیں کیا حتیٰ کہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے بھی ذکر نہیں کیا جنھوں نے منٹو کی بڑی جامع تحقیقی سوانح عمری (**سعادت حسن منٹو (تحقیق)**، لاہور: منٹو اکادمی، ۲۰۰۶ء) لکھی ہے۔ البتہ منٹو کے ایک عقیدت مند ابوالحسن نغمی نے اپنی ذاتی یادداشتوں کو رقم کرتے ہوئے اس سلسلے میں قدرے تفصیل بیان کی ہے۔ ابوالحسن نغمی کی یادداشتوں پر مبنی کتاب **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق) سنگ میل لاہور سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ ابوالحسن نغمی منٹو کے آخری دو تین برسوں میں ان کے بہت قریب رہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں بڑے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں جو منٹو شناسی میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ نغمی صاحب جن دنوں روز نامہ **زمیندار** (لاہور) سے وابستہ تھے ان دنوں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ بیگم منٹو کے کہنے پر انھوں نے منٹو کے لیے ملازمت کی ایک راہ نکالی۔ وہ لکھتے ہیں:

''صفیہ بھابھی مجھ سے مخاطب ہوئیں 'نغمی صاحب! کیا آپ انھیں کہیں نوکر رکھا سکتے ہیں۔؟'

'جی ہاں! بھابھی'۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا۔

''کہاں؟''

''ایک نیا اخبار نکلا ہے۔'' منشور''، میں اس کے ایڈیٹر سے بات کر سکتا ہوں۔ منٹو صاحب روز انہ اخبار کے لیے کالم لکھا کریں''۔ (۱)

لیکن جب منٹو کو پتا چلا کہ اس اخبار کے مالک نواب مظفر علی قزلباش ہیں تو انھوں نے اس اخبار میں کالم لکھنے سے انکار کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ نواب مظفر علی قزلباش چونکہ شیعہ ہیں لہٰذا وہ انھیں شیعوں کی حمایت میں لکھنے کو کہیں گے۔ ابوالحسن نغمی نے جب انھیں یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہو گا تو منٹو راضی ہو گئے لیکن ایک اور شرط یہ لگا دی کہ ایک کالم کے دس روپے نقد دیے جائیں گے تو وہ کالم لکھیں گے۔ ابوالحسن نغمی کہتے ہیں کہ جب میں نے روز نامہ **منشور** کے ایڈیٹر مظفر احسانی کو منٹو کی شرط بتائی تو انھوں نے خوشی سے قبول کر لی اور اپنے منیجر بابو مولا داد کو پابند کر دیا کہ وہ ایک کالم کے منٹو کو دس روپے نقد دیا کریں گے۔ ابوالحسن نغمی لکھتے ہیں:

''میں شاداں و فرماں ''منشور'' کے دفتر سے سیدھا ۳۱ لکشمی مینشنز ہال روڈ، اپنی پیاری بھابھی صفیہ کو مژدۂ جاں فزا سنانے کے لیے پہنچا۔ منٹو صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے خوش خبری سنائی۔ صفیہ بھابھی بہت خوش ہوئیں۔ منٹو صاحب نے مکرّر کالم لکھنے پر آمادگی کا اظہار کر کے توثیق کر دی اور دوسرے ہی دن صبح ہی صبح روز نامہ **منشور** میں منٹو صاحب کا کالم نمایاں طور پر موجود تھا''۔ (۲)

روز نامہ **منشور** کے بارے میں اُردو صحافت کی تاریخ کی کتابوں میں بس سرسری ذکر مل جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیل ابوالحسن نغمی کی ان یادداشتوں ہی میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ سے بددل ہو کر نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کی گئی تھی۔ نام تھا'' پاکستان ری پبلکن پارٹی'' اس سیاسی جماعت نے گوال منڈی لاہور سے روز نامہ **منشور** کا اجرا کیا۔ چونکہ

نواب قزلباش بھی ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے تھے اور چونکہ وہ ذی حیثیت تھے، اس لیے انھوں نے **منشور** کے نام سے اخبار کا اجرا بھی منظور کر لیا''۔ (۳)

اس سلسلے میں ان کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو وہ مزید لکھتے ہیں:

''میں نے اب تک کہیں نہیں پڑھا کہ منٹو صاحب نے چند دن روز نامہ ''منشور'' لاہور کے لیے کالم نویسی بھی کی تھی۔ میری نظر سے یہ بھی نہیں گزرا کہ ری پبلکن پارٹی آف پاکستان کی جانب سے نواب مظفر علی قزلباش نے **منشور** کے نام سے ایک روز نامے کا اجرا کیا تھا''۔(۴)

ابوالحسن نغمی کی یادداشتوں پر مبنی زیرِ نظر کتاب کو پڑھنے سے یہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کا حافظہ اب بھی بہت اچھا ہے دوسرا یہ کہ یہ یادداشتیں انھوں نے اپنی ڈائری کی بنیاد پر مرتب کی ہیں۔ لیکن یہاں روز نامہ **منشور** کے بارے میں اس بات میں انھیں التباس ہوا کہ یہ اخبار ری پبلکن پارٹی (Republican Party) کی جانب سے جاری کیا گیا تھا۔ کیونکہ ۱۹۵۶ء میں یہ اخبار نکل رہا تھا اور اسی زمانے میں منٹو نے اس میں چند کالم بھی لکھے جبکہ ری پبلکن پارٹی اس سے ڈیڑھ دو سال بعد ۱۹۵۶ء میں بنائی گئی تھی۔

نواب مظفر علی قزلباش نے یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مسلم لیگ جب انتشار کا شکار ہوئی تو ڈاکٹر عبدالجبار خان (۱۸۸۲ء۔۱۹۵۸ء) کی قیادت میں ناراض مسلم لیگی ارکان نے ری پبلکن پارٹی قائم کی تو نواب مظفر علی قزلباش بھی اس نئی سیاسی جماعت کا حِصّہ تھے۔ چودھری محمد علی اگست ۱۹۵۵ء میں وزیرِ اعظم مقرر ہوئے تو مسلم لیگ کی صدارت بھی اُن کے پاس تھی۔ انھی کے زمانے میں مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہوئی اور نتیجے میں'' تقریباً راتوں رات'' ایک نئی سیاسی جماعت ری پبلکن پارٹی قائم ہوئی۔ اس وقت اسکندر مرزا صدرِ پاکستان تھے **انسائیکلوپیڈیا واقعات پاکستان** میں لکھا ہے:

''۲۳۔ اپریل ۱۹۵۶ء کو پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ کے ساتھ مسلم لیگی وزرا کو جماعتی ڈسپلن توڑنے کے الزام میں مسلم لیگ کی تنظیم سے نکال دیا....... اسی روز (۲۳۔ اپریل) مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ نے ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ میں شامل جن وزرا کے خلاف انضباطی کارروائی کی انھوں نے ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ مل کر نئی سیاسی جماعت ری پبلکن پارٹی تشکیل دے دی..... ڈاکٹر خان صاحب ہی اس پارٹی کے کنونیز بنے..... ۲۴۔ اپریل کو نئی جماعت کا منشور تیار کرنے کے لیے مخدوم زادہ حسن محمود کی قیادت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی''۔ (۵)

ری پبلکن پارٹی کے ایک اہم رکن فیروز خان نون (۷/مئی ۱۸۹۳ء۔ ۹ دسمبر ۱۹۷۰ء) جو اس پارٹی کے اقتدار میں آنے پر وزیرِ خارجہ بنے تھے وہ اپنی آپ بیتی **چشمِ دید** کے نویں باب میں ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چودھری محمد علی وزیراعظم مقرر ہوئے۔ انھی کے دورِ حکومت میں آئین منظور ہوا اور اسی زمانے میں ری پبلکن پارٹی معرض وجود میں آئی جس کی جذباتی اعانت اور حوصلہ افزائی اسکندر مرزا نے اور جس کی قیادت کا بار ڈاکٹر خان صاحب نے اٹھایا''۔(۶)

تاریخ پاکستان کی اکثر کتابوں میں یہ تاثر عام ہے کہ ری پبلکن پارٹی قائم کرنے میں اسکندر مرزا کا ہاتھ ہے لیکن خود اسکندر مرزا نے اپنی آپ بیتی میں اس سے انکار کیا ہے۔ احمد سلیم نے اسکندر مرزا کی یادداشتوں کی بنیاد پر اپریل ۱۹۵۶ء کی یہ روداد اس طرح بیان کی ہے:

''اپریل کے شروع میں، لاہور میں اسکندر مرزا کے قیام کے دوران کسی نئی سیاسی جماعت کے قیام پر کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی.......

کراچی جانے کے کوئی ہفتہ عشرہ بعد اسکندر مرزا کو لاہور سے ڈاکٹر خان صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے صدر مرزا کو مطلع کیا کہ وہ نئی سیاسی پارٹی بنا رہے ہیں۔ اسکندر مرزا نے استفسار کیا ''کونسی پارٹی؟'' ڈاکٹر خان صاحب نے جواب میں کہا کہ ''میں نے ری پبلکن پارٹی بنا لی ہے''۔

''اس کی ضرورت کیا تھی'' اسکندر مرزا نے مزید استفسار کیا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے جواب دیا ''میں مسلم لیگ والوں پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ انھوں نے مجھے نیچا دکھانے اور جھکانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ میں نے نئی جماعت بنا لی ہے۔ مسلم لیگ کے بیشتر ارکان اب میری پارٹی میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں''۔(۷)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ری پبلکن پارٹی اپریل ۱۹۵۶ء میں اچانک قائم ہوئی۔ اس صورت میں روز نامہ **منشور** کے بارے میں ابوالحسن نغمی کا یہ کہنا کہ ''اس سیاسی جماعت نے گوال منڈی لاہور سے روز نامہ **منشور** کا اجرا کیا'' ان کے حافظے کا سہو ہو سکتا ہے چونکہ یہ اخبار پہلے نکل رہا تھا اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے مالک نواب مظفر علی قزلباش جب ری پبلکن پارٹی میں آئے ہوں گے تو انھوں نے اپنے اخبار کو اس پارٹی کے فروغ اور استحکام کے لیے استعمال کیا۔ پنجاب آرکائیوز (Punajab Archives) سے روز نامہ **منشور** کے ڈیکلریشن (Declaration) کی نقل اگر مل سکے تو اس کے بارے میں یہ بنیادی باتیں واضح ہو سکتی ہیں کہ کس کے نام ڈیکلریشن تھا اور کب یہ اخبار جاری ہوا۔ البتہ ابوالحسن نغمی نے اس سلسلے میں کچھ مزید معلومات فراہم کی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''منٹو صاحب چند ہی روز تک **منشور** کے لیے کالم لکھ سکے۔ بابو مولا داد کے لیے یہ امر مشکل ہوتا ہی چلا گیا کہ بلاناغہ روزانہ منٹو صاحب کو دس روپے نقد دیا کریں۔ **منشور** اخبار کے احوال کچھ اچھے نہ تھے۔ کچھ ہی عرصے تک یہ اخبار چھپتا رہا اور پھر کچھ عرصے تک ڈمی (Dummy) کی صورت میں چھپتا رہا۔ یعنی ''ڈیکلریشن'' قائم رکھنے کے لیے حکومت

کی پریس برانچ کو جاتا رہا اور بالآخر مکمل طور پر بند ہو گیا''۔ (۸)

نوادراتِ منٹو کی اشاعت (۲۰۰۹ء) کے بعد بھی میں اب تک منٹو کی غیر مدوّن تحریروں کی جمع آوری میں مصروف ہوں ۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی مجھے محترمہ نصرت منٹو صاحبہ سے ملتی رہتی ہے۔ دو ایک برس پہلے انھوں نے منٹو کے چار غیر مدوّن کالم مجھے عنایت کیے تھے جو روز نامہ **منشور** میں شائع ہوئے تھے یہی چار کالم اگلے صفحات میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ چاروں کالم ۱۹۵۴ء میں ستمبر کے مہینے کی مختلف تاریخوں میں شائع ہوئے ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روز نامہ **منشور** میں منٹو کے صرف یہی چار کالم شائع ہوئے کیونکہ ۱۶۔ستمبر کے کالم میں منٹو لکھتے ہیں :

''میں نے اپنے پچھلے مضمون میں آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں پاگل خانے کے متعلق تین چار قسطیں اور لکھوں گا''۔ (۹)

اس سے یہ قیاس تقویت حاصل کرتا ہے کہ اس سے پہلے بھی منٹو اس موضوع پر لکھ چکے ہیں اور اس کے بعد بھی مزید کچھ قسطوں میں لکھنا چاہتے ہیں ۔ مطلب یہ کہ اس بات کا امکان ہے کہ پیشِ نظر ان چار کالموں کے علاوہ بھی منٹو کے کچھ کالم **منشور** میں شائع ہوئے ہوں ۔

روز نامہ **منشور** کا فائل کسی لائبریری یا آرکائیوز میں موجود یا میسّر نہیں ہے ۔ جو چار کالم مل سکے اور پیشِ نظر ہیں ان میں سے پہلا ۷ اور دوسرا ۸ ستمبر ۱۹۵۴ء کے **منشور** میں چھپا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد ۱۶ ستمبر کو تیسرا اور ۱۸ ستمبر کو چوتھا کالم شائع ہوا۔ ان سارے کالموں کا عنوان ''دستِ وگریباں'' ہے اور یہ منشور کے صفحہ ۳ پر چھپتے تھے۔ ان میں سے پہلے کالم کا موضوع وہ حکومتی اقدام (یا صرف سوچ) ہے جس کے تحت طوائفوں کو شہر بدر کیے جانے پر غور ہو رہا تھا۔ منٹو نے اس کی مذمت کی ہے ۔ منٹو نے اپنے دوسرے کالم میں ان عورتوں اور لیڈی ڈاکٹروں کو موضوع بنایا ہے جو معاشقوں اور اسقاطِ حمل میں معاون ہوتی ہیں ۔ ۱۶۔ اور ۱۸ ستمبر کے دونوں کالم پنجاب مینٹل ہسپتال لاہور کے بارے میں ہیں جن میں وہاں کے ناقص انتظام کی نشاندہی اور کچھ تجاویز دی ہیں ۔ پاگل خانے پر اس زمانے میں منٹو نے تسلسل کے ساتھ لکھا جو بعض دیگر اخبارات اور رسائل جیسے **آفاق** اور **ڈائریکٹر** میں بھی شائع ہوا بلکہ **منشور** کے ان دو کالموں میں جو کچھ ہے وہ اصل میں اس سے پہلے چھپ چکا ہے ۔ ویسے تو یہ چاروں کالم منٹو کے کسی مجموعے یا کلیات میں شامل نہیں ہیں لیکن پاگل خانے پر دونوں کالم اس حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کوئی بھی تحریر منٹو کے کلیات یا مجموعوں میں نہیں ہے ۔

روز نامہ **منشور** میں چھپنے والے منٹو کے کالموں کے بارے میں ابوالحسن نغمی لکھتے ہیں :

''جن دنوں انھوں نے یہ کالم لکھے تھے وہ آلام و مصائب کے لحاظ سے ان کی زندگی کے تاریک ترین دن تھے لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ وہ کالم نہایت شگفتہ تھے، طنز و مزاح سے بھر پور تھے''۔ (۱۰)

ممکن ہے **منشور** میں منٹو کے ان چار کالموں کے علاوہ بھی کچھ کالم ہوں جن کی شگفتگی ابوالحسن نغمی کو یاد رہ

گئی ہو ورنہ پیش نظر چاروں کالموں میں شگفتگی اور مزاح کی بجائے حقیقت نگاری ہے طنز نے جس کا رنگ چوکھا کر دیا ہے لیکن نہ اتنا کہ نشتر بن سکے ۔ اب اگلے صفحات میں منٹو کے چار غیر مدوّن کالم ملاحظہ فرمایئے جو اپنی پہلی اشاعت کے تقریباً سڑسٹھ برس بعد منظر عام پر آ رہے ہیں ۔

(۱)

دست و گریباں !

ایک عرصے سے ہماری حکومت سوچ رہی ہے کہ جسم فروش عورتوں اور طوائفوں کو شاہی محلے سے نکال کہیں اور پھینک دے ۔ اصل میں اُن کو یہ خیال اس وجہ سے آیا کہ مسجد اور وہ بھی شاہی ، اس کے زیر سایہ کوئی خرابات نہیں ہونی چاہیے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر مسجد کے زیر سایہ خرابات ہوتی ہے ___ کیونکہ اُس کا سایہ اس کی پناہ کا پناہ گاہ ہوتا ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ حرام کاریاں اکثر مندر و خانقاہ اور گرجا و کلیسا میں زیادہ پنپتی ہیں ۔ راہب خانے تو خیر گناہوں کے سب سے بڑی آماجگاہ ہیں ۔ مندروں میں دیوداسیاں جوگل کھلاتی ہیں ، اس سے میرا خیال ہے ہر بالغ نظر باخبر ہوگا۔ راہب خانوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے بھی یقیناً ہر اس شخص کو جو انسانی نفسیات سے ذرا بھی دلچسپی رکھتا ہے واقف ہونا چاہیے۔

نفس کشی ہوسکتا ہے ، بہت ہی بڑی قربانی ہو، لیکن اس کے نتائج کبھی اچھے اور صحت مند ثابت نہیں ہوئے ۔ انسان جب اپنی فطرت کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے تو اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے اپنا انتقام لیتی ہے ___ یا تو وہ اسے سنکی اور پاگل بنا دیتی ہے ___ یا پرلے درجے کا ریاکار ۔ در پردہ وہ سب کچھ کرتا ہے۔ جس کے لیے اس کی آفرینش ہوئی تھی ___ لیکن لوگوں پر ہمیشہ یہی ظاہر کرے گا کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہے ۔

معاف کیجیے گا ۔ میں ایک بڑی گستاخ بات کہنے ولا ہوں۔ داتا گنج بخش کا مزار ہے ۔ آپ کبھی وہاں کے حجروں میں جایئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ہر قسم کا گناہ عمل میں لایا جاتا ہے ۔ آپ کو وہاں شراب مل سکتی ہے ۔ گانجا مل سکتا ہے چرس مہیا ہوسکتی ہے ۔ افیم مل سکتی ہے اور اگر آپ چاہیں تو کوئی عورت بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں کہ داتا کے سائے میں آرام سے عیش کرسکیں ۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ___ دراصل میں ایسے معاملوں میں اکثر بہک جاتا ہوں ___ بات ہیرا منڈی کی ہو رہی تھی ___ لیجیے اب میں نے اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے ___ آخر اس کا نام ہیرا منڈی کیوں رکھا گیا ہے ، کیا یہاں مغلوں کے زمانے میں ہیروں کے تاجر رہتے تھے ؟ ___ یا اس کا نام کسی رنڈی ''ہیرا'' سے متعلق ہے ؟ ___ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تعیش پسند حضرات نے یہاں کی ہر رنڈی کو ہیرا سمجھا ہو، اور جذباتی ہو کر اس جگہ کا نام ''ہیرا منڈی'' رکھ دیا ہو ۔ بہر حال اس بارے میں تحقیق ضرور ہونی چاہیے۔ میرا خیال ہے ، آغا..... (۱۱) ''اس بازار'' کے پیر ہیں ، اس دقیق مسئلے پر روشنی ڈال سکتے ہیں ۔

میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ حکومت ہیرا منڈی کو کہیں اور منتقل کر دینا چاہتی ہے ، پچھلے دنوں سننے میں آیا تھا کہ

یہ منڈی دریائے راوی کے قریب آباد کی جائے ___ لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا، شاید اس لئے کہ اس دریا میں اکثر سیلاب آتا رہتا ہے ___ اور حکومت کو یہ اندیشہ ہو کہ سیلاب کہیں ان کی ساری کالونی کو بہا کر پھر اسی جگہ نہ پہنچا دے جہاں سے وہ منتقل کی گئی تھی۔

معاملہ کچھ بھی ہو ہیرا منڈی، شاہی مسجد کے سائے تلے ابھی تک قائم ہے۔ ادھر موذن اذان دیتا ہے، اِدھر کوٹھوں پر طبلے کی تھاپ پڑتی ہے اور مجرے ہوتے ہیں۔ شعلہ بائی گا رہی ہے۔

ابھار دیکھ کا بنا جو میرے ے

اور شاہی مسجد کے گنبد اپنے ابھار کو دیکھ دیکھ کر شرمسار ہو جاتے ہیں۔ ویسے وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان میں زیادہ پختگی ہے۔

ہیرا منڈی کو کہیں منتقل کر دیا جائے ___ ہوسکتا ہے اس کا نام بھی تبدیل ہو جائے۔ مگر اس کی اہمیت جوں کی توں قائم رہے گی ___ کراچی میں جسم فروشی کو ناجائز قرار دیا گیا۔ وہ محلے اور کوچے جہاں ایسی عورتیں رہتی تھیں۔ جو پیشہ کرتی تھیں، ان کو قانوناً وہاں سے اٹھنے پر مجبور کیا ___ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ عورتیں ادھر ادھر پھیل گئیں اور انھوں نے اپنا پیشہ جاری رکھا۔

ایسی اکثر عورتوں نے اپنی رہائش گاہوں کے باہر اس قسم کے بورڈ لگا لیے ''مس الفت جہاں ڈانسر'' ___ ''بیگم نسرین ریڈیو سنگر'' ___ اب ان پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنا جسم، گلا یا اپنے نرت فروخت کرتی ہیں۔ اس پر حکومت کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا، چنانچہ وہ محفوظ ہیں۔

لیکن ایسے کئی لطیفے ہوئے ___ تماش بین حضرات ان کوٹھوں پر جاتے تو پولیس کے سپاہی جو احتساب کے لیے مقرر کیے گئے تھے، اس کے ساتھ ہو جاتے ___ بیچاروں کو مجبوراً گانا سننا پڑتا۔ بعض رنڈیوں نے یہ جواز نکال لیا کہ جوان کے پاس آیا ہے۔۔۔(۱۲)

(روزنامہ منشور، لاہور: ۷ ستمبر ۱۹۵۴ء، ص:۳)

(۲)

دست و گریباں!

پرانے زمانے میں کٹنیاں ہوتی تھیں، جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ آسمان میں تھگلی لگاتی تھیں۔ جب کوئی مرد، کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تھا، تو وہ انہی کٹنیوں سے رجوع کرتا، اور وہ اس کی مشکل کسی نہ کسی طرح اپنی حکمت عملی، یا کسی دوسرے ہتھکنڈے سے دور کر کے اس کو، اس کی محبوبہ کے وصال کے تمام ذرائع فراہم کر دیتی تھیں۔

ہمارے پرانے افسانوی ادب میں ان کٹنیوں کا ذکر بڑی افراط سے ہے۔ آپ کسی بھی کرم خوردہ کتاب کو اٹھایئے، آپ کو یہ تاریخی عورت جسے آج کل کے محاورے کے مطابق ''امرت دھارا'' کہہ سکتے ہیں مل جائے گی۔

عورتیں یقیناً مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔ مگر حقیقت ہے کہ اس میدان میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں ___ آج کل وہ افسانوی کٹنیاں تو موجود نہیں لیکن ان کا نعم

البدل ہیں۔جنھوں نے ان کا نام اور ان کی روایات ابھی تک زندہ رکھی ہیں۔

ان قابل احترام عورتوں میں سے محض سکول یا کالج کی ''مائیاں'' ہیں خدا انہیں سلامت رکھے انہیں کی مہربانی سے نوجوان لڑکوں کے خط ،لڑکیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

کئی مرتبہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک خط جو سن چالیس میں پوسٹ کیا،سن پچاس میں مکتوب الیہ تک پہنچا مگر ان ''مائیوں'' کو اگر کوئی خط دیتا ہے تو وہ فوراً ''ڈلور'' ہو جاتا ہے ___ مگر اس پر ٹکٹ چھ پیسوں کا نہیں لگتا کم از کم پانچ روپے کا اسٹامپ جو کرنسی نوٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ان ''مائیوں'' کے ہاتھ پر چسپاں کرنا پڑتا ہے___ اس کا مطلب ''ایکسپریس ڈلوری'' ہے۔

اِن مائیوں نے کتنی لڑکیوں کی عصمت دوسروں کے حوالے کی ہے، اِس کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے ___ جب سے اسکول اور کالج قائم ہوئے ہیں، اُس وقت سے لے کر اب تک کے اگر اعداد و شمار کیے جائیں تو بڑے بڑے مہندس عاجز آ جائیں ___ یہ انہی مائیوں کی مہربانی ہے کہ ہمارے یہاں کی بعض نام نہاد لیڈی ڈاکٹروں کی دکانیں چل رہی ہیں۔

اِن لیڈی ڈاکٹروں کے اشتہار آپ نے اکثر اخباروں اور رسالوں میں دیکھے ہوں گے___ جن سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایسی عورتوں سے مخاطب ہیں۔ جو اپنا ناجائز بچہ ضائع کرانا چاہتی ہیں۔اسی طرح مختلف دوا خانے ایسی دواؤں کا اشتہار دیتے ہیں کہ جن عورتوں کی ماہواری رُک گئی ہو، اِن سے مستفید ہو سکتی ہیں___ ساتھ ہی خطرے کا یہ الارم بھی بجایا گیا ہوتا ہے کہ حاملہ عورت اگر انہیں استعمال کرے گی تو اسقاط ہو جائے گا اس کا مطلب واضح ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ایسے اشتہاروں پر احتساب کیوں نہیں کرتی۔ فحاشی کے بارے میں تو ضرورت سے زیادہ سخت گیر ہے لیکن یہ خاص قسم کی دوائیں ،جن کے اشتہار قریب ہر پرچے میں موجود ہوتے ہیں۔ ان پر اُس کی گرفت اتنی ڈھیلی کیوں ہے۔

میں ناصح کبھی تھا، نہ اب ہوں لیکن خدا لگتی بات ضرور رکھتا ہوں ___ لڑکیاں عنفوانِ شباب میں غلطی کر بیٹھتی ہیں ،لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی ہری بھری کوکھ کو جھلسا دیں....................

..............................(۱۳) میں تو یہ کہوں گا کہ ایسی لڑکیاں یا عورتیں قاتل ہیں۔

بات کٹنیوں کی تھی اور پہنچ گئی لیڈی ڈاکٹروں تک ___ حالانکہ مجھے آپ سے آج خاص طور پر ایک ''آپا'' کا ذکر کرنا تھا، جو آج سے کچھ عرصہ پہلے لاہور کے ایک علاقے میں رہتی تھی۔اس کا کام بڑے عام الفاظ میں ''دلال'' تھا۔اس کے پاس کئی خوبصورت اور بدصورت لڑکیاں موجود تھیں جن سے یہ محترمہ استفادہ فرماتی تھیں۔

مجھے اس ''آپا'' سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی گھریلو قسم کی عورت تھی شادی شدہ۔ جب میں اس سے ملا تو وہ پیٹ سے تھی ،مگر اپنے کاروبار میں مصروف ، بڑی کائیاں ____ ان لڑکیوں کے متعلق جو اس کی تحویل میں تھیں ،ایسی ایسی کہانیاں سناتی تھی کہ بڑے بڑے سرمایہ دار پیشہور تعیش پسندوں کی باچھیں کھل جائیں۔

روٹی پکا رہی ہے اور گاہک سے باتیں کیے جا رہی ہے ــــ بڑے نرم و نازک لہجے میں ۔ وہ گاہک یوں محسوس کرتا ہے کہ بہن کے گھر میں بیٹھا ہے ۔

''آپا'' کی پہنچ دور دور تک تھی ــــ وزرائے کرام سے لے کر معمولی اے ایس آئی تک اس کا واقف تھا، چنانچہ وہ بلا خوف و تردد اپنے کاروبار میں مشغول رہتی تھی۔ اس میں ایک خاص وصف تھا جو میرے دوستوں نے بتایا۔ جن کے ساتھ ایک مرتبہ میں اس کے یہاں گیا تھا۔ کہ وہ وقت کی بڑی پابند ہے۔

اگر اس نے کہہ دیا ہے کہ وہ شام کو چھ بجے فلاں ہوٹل میں دو لڑکیاں لے کر پہنچ جائے گی تو عین وقت پر وہاں تانگے میں پہنچ جاتی۔ اگر اتفاق سے آپ وقت پر نہیں پہنچے تو وہ بڑے اطمینان سے چائے منگوائے گی اور انتظار کرے گی۔ اگر آپ کسی وجہ سے نہیں آ سکے تو وہ اسی اطمینان سے ہوٹل والے سے کہہ دے گی کہ بل آپ کا فلاں صاحب ادا کر دیں گے۔

معلوم نہیں ۔ ایسی آپائیں کتنی ہیں ۔ جو اپنے دامن عصمت کو تو محفوظ رکھتی ہیں ــــ لیکن دوسری لڑکیوں اور عورتوں کے دامنِ عصمت کو ملوث کر کے روزی کماتی ہیں ۔

(روزنامہ **منشور**، لاہور: ۸ستمبر۱۹۵۴ء، ص:۳۔۴)

(۳)

دست و گریباں !

میں نے اپنے پچھلے مضمون میں آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں پاگل خانے کے متعلق تین چار قسطیں اور لکھوں گا ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکا کیونکہ مجھے چند حقائق کا تجزیہ کرنا تھا۔ میں نے اس دوران میں دو مرتبہ اپنے دوستوں کے ہمراہ پاگل خانے کا معائنہ کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے پہلے جو کچھ لکھ چکا ہوں اس میں چند غلطیاں ہیں ۔ اصل میں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں پاگل خانہ ایک بہت بڑی ریاست ہے اور اس ریاست پر قبضہ کرنے کی ہر شخص کی خواہش ہو گی۔

موجودہ سپرنٹنڈنٹ کے متعلق جو کچھ میں پہلے لکھ چکا ہوں ، اس میں ان کے اپنے بیان کی ''معصومی'' کا بہت اثر تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا جہاں ہم رہتے ہیں سراسر فراڈ ہے۔

موجودہ سپرنٹنڈنٹ صاحب جن کی تعریف میں کر چکا ہوں میرے ہاں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کئی ایک فائلیں بھی تھیں جو انھوں نے مجھے دکھائیں اور میں ان سے متاثر ہوا۔ ذہنی مریضوں کی کرب ناک حالت پر انھوں نے کئی آنسو بہائے ۔

میں ایک عجیب مخمصے میں گرفتار تھا کہ آیا یہ شخص مخلص ہے یا نہیں ۔ میں اس مخمصے میں کئی دن گرفتار رہا ۔ یہی وجہ ہے کہ **منشور** کا یہ کالم اتنے دن نہ لکھ سکا۔

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں پاگل خانے کے بارے میں جسے پنجاب مینٹل ہاسپٹل کہا جاتا ہے کافی لکھوں گا۔ یہ ارادہ بدستور موجود ہے ۔ میں نے دو مرتبہ خود اس ادارے کا معاینہ کیا ۔ اس سے مجھے یہی محسوس ہوا تھا

کہ اس میں کافی ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ترقی جیسا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے، سپرنٹنڈنٹ صاحب کی تنزلی کا باعث ہوئی ہے۔

آج کل وہ ''انکوائری'' کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ ان پر بے شمار الزامات عاید ہیں۔ آج کے اخبار میں یہ پڑھا ہے کہ ان کو معطل کیا جا رہا ہے یا کہیں اور تبدیل کیا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں وہ کہاں تبدیل کئے جائیں گے۔ بہر حال میری دعا ہے کہ ان کی جگہ کوئی ایسے صاحب آئیں جو پاگل خانے جیسے اہم ادارے کی اصلاح فرما سکیں۔

میری اپنی رائے ہے جس سے نائب ناظم صاحب بھی (جس زمانے میں مَیں وہاں مقیم تھا) متفق تھے کہ وہاں کے محافظ جنھیں مریض سپاہی کہہ کر پکارتے ہیں ان کی وردی پولیس والوں کی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ مینٹل ہاسپٹل کو سنٹرل اور بورسٹل جیلوں کے پاس نہیں ہونا چاہیے پھر یہ کہ ذہنی مریضوں کے لیے ایسی دیواریں نہیں ہونی چاہیں جو سنٹرل اور بورسٹل جیل سے مشابہ ہوں۔

اس کے علاوہ میری اپنی خواہش ہے کہ پاگل خانے کو ''انسان خانہ'' بنایا جائے۔ اس میں ذہنی مریضوں سے مجرموں کا سا سلوک نہ کیا جائے۔ ان سے ''مشقت'' ان کی تربیت سابقہ کے مطابق لی جانی چاہیے اور محافظ جنھیں پاگل خانے کی اصطلاح میں سپاہی کہا جاتا ہے ان کی باقاعدہ تربیت ہونی چاہیے۔ انھیں یہ سکھانا چاہیے کہ وہ معذور پاگلوں کی خدمت کیسے کر سکتے ہیں؟

کیونکہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہاں محافظ ٹریفک کے سپاہیوں کی طرح پاگلوں کے چالان کرتے رہتے ہیں۔ ان سے چونکہ ان کو کچھ وصول نہیں ہوتا جس طرح ٹریفک کے سپاہیوں کو ہو جاتا ہے، وہ ان کو زدوکوب کرتے ہیں۔

میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر کوئی انسانیت نواز، ہمدرد اور درد شناس سپرنٹنڈنٹ ان پاگلوں کی دنیا میں آ جائے تو وہ نہال ہو جائیں گے۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ وہ روٹی کے بھوکے رہیں، پانی کے پیاسے رہیں لیکن وہ محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ان سے آپ پیار کی ایک بات کہہ دیجیے اس لمحے کے لیے:۔

ان کی ساری دیوانگی غائب ہو جائے گی۔

بڑے جوش سے آئے ہوئے پاگلوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن جب میں نے ان سے پیار محبت کی بات کی تو ان کا سارا جوش سرد ہو گیا۔ ورڈز ورتھ نے کہا ہے؛ ''زرگراں بہا ہے لیکن مخلصانہ انسانی ہمدردی اس سے فزوں تر ہے۔''

(روزنامہ منشور، لاہور: ۱۶ ستمبر ۱۹۵۴ء، ص:۳)

(۴)

دست و گریباں!

میں اس سے پیشتر پاگل خانے کے متعلق اپنے تاثرات بیان کر چکا ہوں۔ اب مجھے کچھ اور عرض کرنا ہے کہ اس ادارے کے طرز رہائش کے متعلق خاص توجہ کرنی چاہیے۔ عمارت ایسی ہو کہ اس میں مریض خود کو محبوس محسوس نہ کرے۔

مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ معمولی اعصابی مریضوں کو پاگل خانے بھیجنا نہیں چاہیے۔ ان کو کسی معمولی اسپتال میں داخل کر دیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ نفسیات کا کوئی بھی ماہر اس کی تصدیق کر سکتا ہے کہ یہ اعصابی مریض پاگل خانے میں رہ کر واقعی پاگل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی فضا ایسی ہے کہ اچھا بھلا فرزانہ دیوانہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی ممالک کے ذہنی شفاخانوں میں کوئی ڈاکٹر تین یا چار سال سے زیادہ نہیں رکھا جاتا اور اس کے بعد کسی اور عام ہسپتال میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ میں یہ کہوں گا کہ جو پاگل لاوارث ہوں ان کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ پیدا کی جائے جہاں وہ اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں، تاکہ یہ احتمال نہ ہو کہ وہ پھر اپنی مشکلات کے باعث ذہنی امراض میں مبتلا ہو جائیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت ۱۴۰۰ پاگلوں میں کئی ایسے ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ اگر ان لاوارثوں میں سے کسی کو صحت مند قرار دے کر رخصت کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ بازاروں اور گلیوں کی خاک چھانتا پھرے گا۔ اور آخر میں پہلے سے زیادہ دماغی مریض ہو جائے گا۔

___ انسان پاگل کیوں ہوتا ہے۔ اس سے متعلق میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کی کئی وجوہ ہیں، جن میں سے مَیں چند بیان کیے دیتا ہوں۔

ایک بھوک ہے جس کی کئی قسمیں ہیں۔ پیٹ کی بھوک، جنسی بھوک، شفقت کی بھوک اور دولت کی بھوک۔

دوسری وجہ عشق میں ناکامی، میاں بیوی کا بے جوڑ تعلق یا کوئی جسمانی حادثہ وغیرہ۔

ان تمام متعلقات پر کوئی نفسیات کا ماہر ہی غور کر سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں ایسا کوئی ماہر موجود نہیں ہے جو انسانی نفسیات کی باریکیوں کو سمجھ سکے۔

حالانکہ ایک ذہنی مریض کا علاج کرنے کے لیے اس کے تمام عواقب وعواطف کو سمجھنا ضروری ہے۔

پاگل خانے میں پاگلوں کو بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے ہیں، جن سے ان پر مصنوعی مرگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے چند منٹ تک تشنج کا عالم رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ دس منٹ تک عالم برزخ میں رہتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ بجلی کا یہ ٹیکہ لگانے کے بعد، جب ان مریضوں کا تحت الشعور بیدار ہوتا ہے تو ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ حالانکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مریض اپنے صحیح حالات ہذیانی کیفیت میں بڑبڑا کر کہتا ہے۔ لیکن اس وقت اس کے پاس دوسرے ٹیکے لگے ہوئے مریضوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(روزنامہ منشور، لاہور: ۱۸ ستمبر ۱۹۵۴ء، ص: ۳)

حواشی وحوالہ جات:

(۱) نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص: ۱۰۹
(۲) نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، ص: ۱۱۱
(۳) نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، ص: ۱۱۰
(۴) نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، ص: ۱۱۲-۱۱۳
(۵) انجم، زاہد حسین، **انسائیکلو پیڈیا واقعاتِ پاکستان** (جلد اوّل)، (لاہور: نذر سنز پبلشرز، ۲۰۰۵ء)، ص: ۴۹۵-۴۹۶
(۶) نون، فیروز خان، **چشم دید**، (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۷ء)، ص: ۳۶۲
(۷) احمد سلیم، اسکندر مرزا: **ایک صدر کا عروج و زوال**، (لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۴ء)، ص: ۲۱۶-۲۱۷
(۸) نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، ص: ۱۱۷
(۹) منٹو، سعادت حسن، دست و گریباں (کالم) **روزنامہ منشور**، (لاہور: ۱۶-ستمبر ۱۹۵۴ء)، ص: ۳
(۱۰) نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، ص: ۱۱۳
(۱۱) مطبوعہ کالم میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ یہ کون سے آغا ہیں البتہ منٹو نے ضرور پورا نام لکھا ہوگا۔
(۱۲) اس کالم کا باقی حِصّہ اخبار کے اگلے صفحہ نمبر ۴ پر ہے لیکن وہ صفحہ میسّر نہیں ہے۔
(۱۳) یہاں سے بھی کالم کی کچھ عبارت ادارت کی نذر ہوئی ہے اور مطبوعہ کالم میں خالی جگہ کے نشان کے ذریعے گویا یہ بتایا گیا ہے کہ منٹو نے یہاں جو کچھ لکھا اُس کو
نا قابل اشاعت سمجھتے ہوئے اخبار نے حذف کر دیا ہے۔

ماخذ:

☆ احمد سلیم، اسکندر مرزا: **ایک صدر کا عروج و زوال**، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۴ء
☆ انجم، زاہد حسین، **انسائیکلو پیڈیا واقعاتِ پاکستان** (جلد اوّل)، لاہور: نذر سنز پبلشرز، ۲۰۰۵ء
☆ منٹو، سعادت حسن، دست و گریباں (کالم) **روزنامہ منشور**، لاہور: ۷-ستمبر ۱۹۵۴ء
☆ منٹو، سعادت حسن، دست و گریباں (کالم) **روزنامہ منشور**، لاہور: ۸-ستمبر ۱۹۵۴ء
☆ منٹو، سعادت حسن، دست و گریباں (کالم) **روزنامہ منشور**، لاہور: ۱۶-ستمبر ۱۹۵۴ء
☆ منٹو، سعادت حسن، دست و گریباں (کالم) **روزنامہ منشور**، لاہور: ۱۸-ستمبر ۱۹۵۴ء
☆ نغمی، ابوالحسن، **سعادت حسن منٹو** (ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
☆ نون، فیروز خان، **چشم دید**، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۷ء